نہیں دیا جاتا، بلکہ علماء ہر ہر زبان میں تحقیق و تنقید کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ انگریزی ترجمہ کتنا مستند ہے، اس پر انگلستان کو ہمیشہ فخر رہا ہے، اس پر بھی کئی بار نظر ثانی ہو چکی ہے حضرت مسیح اور ان کے تلامذہ نے جس زبان میں گفتگو کی، وہ آرامی ہے لہٰذا اناجیل کے آرامی ترجمہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہونا چاہیئے چنانچہ عیسائی محققین ہمیشہ اس ترجمہ کی تصحیح و تحسین کے درپے رہے ہیں۔ حال ہی میں عہد نامہ قدیم و جدید کے آرامی ترجمہ کا از سر نو جائزہ لیا گیا ہے اور گیارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد جارج لمزا نے بہت سی ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، ان کا خیال ہے کہ بائیبل میں آرامی زبان کو کماحقہ نہ جاننے کی وجہ سے، یہ لغزشیں عام ترجموں میں صدیوں سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ انھوں نے تصحیح کے سلسلہ میں کس درجہ محنت کی ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ انھوں نے ان مخطوطات کو حرف بحرف پڑھا ہے جو مخطوطات یونان کے نام سے مشہور ہیں اور جو سولہ سو سال پرانے ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ بائیبل کے بارہ میں جو اعتنا اور توجہ کا عالم عیسائی علماء محققین میں پایا جاتا ہے، کیا ہمارے ہاں کسی درجہ میں بھی وہ اعتناء قرآن سے متعلق پایا جاتا ہے؟ ہمارے ہاں ترجمہ و تشریح کی جو کوششیں ہوئیں کیا ان پر کبھی اعلیٰ پیمانہ پر غور کیا گیا؟ کبھی اونچے درجے کے ادبا عربی اور اردو کے جاننے والوں نے ایک جگہ بیٹھ کر سوچا کہ پرانے اور نئے ترجمے اصلاح و تحسین مزید کے متقاضی ہیں ——— اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں انفرادی کوششیں ہوئیں اور خوب ہوئیں مگر کون کہہ سکتا ہے کہ انہیں اس سے زیادہ چمکانا ممکن نہیں۔

مثال کی غرض سے موجودہ مشہور اُردو ترجموں کو لیجئے۔ ان میں خوبیوں کے ساتھ بعض خامیاں بھی نظر آئیں گی۔ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ بڑی محنت اور اخلاص سے کیا گیا ہے، لیکن اس پر اس لئے گفتگو نہیں کی جاسکتی کہ اس کی زبان بہت پُرانی ہے، اور ترجمہ اس درجہ لفظی ہے، کہ آیت کی روح اس سے واضح نہیں ہو پاتی۔

علامہ نذیر احمد کے ہاں زبان و محاورہ کا غلبہ ہے ایک نقص اس میں یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ قرآن کا صحیح صحیح مفہوم بیان کریں ان کو زیادہ فکر اس کی رہتی ہے، کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے کہیں وہ ٹکسال باہر تو نہیں۔ اس غلو کا یہ نتیجہ ہے، کہ کہیں کہیں ابتذال بھی آگیا ہے۔

فتح الحمید ان سے نسبتہً بہت اچھا ترجمہ ہے لیکن اتنا جاندار نہیں۔ مولانا تھانوی کا ترجمہ صحت کے اعتبار سے جواب نہیں رکھتا۔ مزید براں اس میں یہ خوبی بھی ہے، کہ جو مقامات فقہی استدلال کے حامل ہیں ان کو اُسی فقہی اہمیت کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ لیکن زبان کا معیار اونچا نہیں ——— مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ترجمہ بہت پیارا ہے۔ زبان بھی خاصی ہے۔ مگر اس میں یہ قباحت ہے کہ جہاں ان کے خاص فرقہ وارانہ معتقدات سے تصادم ہوتا ہے، وہاں اچھی خاصی تحریف بھی ہے ——— مولانا عبدالحق حقانی کا ترجمہ البتہ ایسا ہے جو ہر لحاظ سے کامیاب ہے لیکن اس میں جتنا سرسید کے کلامی مخترعات کا خیال رکھا گیا ہے، اتنا دُوسری چیزوں کا نہیں۔ معاصرین کے ترجموں کو خدشہ نزاع سے ہم چھوڑ رہے ہیں۔ یہ سرسری سا جائزہ اس لئے پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ ہمارے اس خیال کی تائید ہو کہ ایک زیادہ مستند، زیادہ سُلجھے ہوئے